مابعد سچائی حقیقت یا افسانہ: اکیسویں صدی کے اردو ادب کے تناظر میں

ڈاکٹر فضیلت بانو

Dr. Fazeelat Bano

Associate Professor, Department of Urdu,
Minhaj University, Lahore.

Abstract:

Literature is the combination of human life encircled all the aspects of life with aesthetic sense and socio, political analysis of society. In Urdu literature short stories are full of variety and diversity. We find all types of short stories and almost every types of characters in Urdu. These characters present different social problems describe the emotions, feelings and psychology of human behavior against the resistance of the different aspects of social injustice and destruction of human values in effective and touching way. This article attempts to highlight the human behavior in short stories in urdu literature.

تاریخِ ادب کے مختلف ادوار میں افسانے کی مختلف تعبیریں سامنے آتی رہی ہیں۔آج کا ادب متصوفانہ اور اساطیری قدروں سے خالی نظر آتا ہے، ادب کی ادبیت اور افسانے کی افسانویت دونوں تنقید نگاروں کی زد میں ہیں۔افسانوی ادب اپنے آغاز سے اب تک ایک جہت میں سفر کرتا آیا تھا مگر لسانیاتی افتراق اور مخصوص مباحث کے باعث اس کی کئی جہتیں سامنے آئیں مثلاً ترکِ وطن اور ہجرت کا ادب، مابعد نو آبادیاتی ادب، نسائی ادب، زندانی ادب، احتجاجی ادب، حقیقت پسندانہ ادب اور دوسری جنگ عظیم کے بعد کا ادب۔ٹیکنالوجی کی ترقی نے بھی ادب کو ایک جمہوری شکل دے دی ہے۔انٹرنیٹ نے بھی ادب میں نئی راہیں کھول دی ہیں ارتباط باہمی فکشن اور ماورائے متن فکشن جیسی نئی نئی ہیئتیں سامنے آئی ہیں۔علاقائی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر نے افسانہ نگار کی فکر کو بدل کر رکھ دیا ہے۔انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے انتشار پسندی اور شدت پسندی میں اضافہ ہوا ہے۔اکیسویں صدی کے بعد کا افسانہ سود و زیاں جیسے بنیادی عوامل اور عالمیت کے اثرات کا حامل نظر آتا ہے، زبان اور لفظیات کی فطری تشکیل میں عصری معنویت، تنوع اور میڈیا بوم کے تفاعل کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔آج افسانوں میں زندگی کا عکس تلاش کیا جاتا ہے۔عالمگیریت اور صارفیت نے افسانے کی نوعیت اور معنویت کو بدل کر ماحول کی رومانویت کو نگل لیا ہے۔ اب بات استعاورں میں نہیں جبلتوں کے پیش نظر کی جانے لگی ہے۔معاشی زاویوں نے تخلیق کے زاویے بھی بدل دیے ہیں۔ تکنیکی ہی نہیں تخلیقی تجربے بھی بدل گئے۔نئی اصطلاحوں نے افسانے کا بیانیہ ہی بدل دیا ہے۔اکیسویں صدی کے افسانے میں عصری حسیت اور آگہی کا بھرپور اظہار سامنے آیا ہے۔تخلیق کی تکنیک یکا یک نہیں بدلتی اس کے کچھ فطری اسباب بھی ہوتے

ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے حالات کا منظر نامہ بدل کر رکھ دیا تھا باقی کی کسر گلوبلائزیشن نے پوری کر دی، اب کہانی اور افسانے میں صرف گھر، گاؤں اور قصبہ نہیں ہوتا بلکہ عالمگیریت کا ایک وسیع تصور پایا جاتا ہے۔

اُردو زبان کے آغاز میں افسانے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی افسانہ اردو ادب میں بطور صنف بیسویں صدی کے اوائل میں سامنے آیا۔ اردو افسانہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے اس سے پہلے اردو نثر میں داستان اور ناول کا رجحان زیادہ ملتا ہے بلکہ اردو نثر میں داستان کو ہی اولیت حاصل تھی۔ افسانے سے مراد ایسی نثری کہانی جس میں کوئی ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہو جس کا آغاز ہو، ابتدا ہو، ارتقائی مراحل ہوں اور پھر خاتمہ ہو اور وہ زندگی کی بصیرت میں اضافے کا باعث بنے، جس میں زندگی کے کسی ایک یا کئی گوشوں کو کم سے کم الفاظ میں اجاگر کیا گیا ہو۔ افسانہ کی صنف مغربی ادب سے مستعار لی گئی ہے۔ عام طور پر افسانے کے موضوعات مقامی اور عوامی عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ یہ اتنا مختصر ہو کہ ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے اور اسے پڑھنے کے بعد قاری ایک خاص جذباتی کیفیت سے گزرے۔ افسانہ ادب کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مختصر ترین صنف ہے۔ جس میں اختصار اور سادگی کے علاوہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو فنی طریقے سے پیش کیا جاتا ہے:

> ''ادب کی ایسی صنف جس کی کیفیت اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتی ہے، کہانی کی حیثیت سے یہ افراد کی جسمانی یا ذہنی سرگرمی سے متعلق واقعات کے سلسلے یا ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہے چنانچہ سارے افسانوی ادب کی طرح یہ بھی نقش گری کرتی ہے اور اس کی کامیابی قاری اور موضوع کی نقاشی کے مابین فوری رابطہ پر منحصر ہے، تاہم مختصر افسانے کی حیثیت سے یہ تاثر کی فوری ترسیل ناول کے عمومی وسائل رساں اور سہولت کے ساتھ کردار نگاری تفصیلی بیانات اور تکرار کی مدد سے نہیں بلکہ آئینہ برق رفتاری کے ساتھ مکمل نقش اجاگر کرتے ہوئے ممکن بناتا ہے۔''(۱)

قصہ کہانی اور افسانہ گوئی کے فن نے انسانی ارتقا کے ساتھ ہی ترقی کی منزلیں طے کیں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہو کے رفتار زمانہ کے ساتھ انسانی تہذیب و ثقافت پر انمٹ نقوش مرتب کیے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں جو انقلابی تبدیلیاں آئیں ان کے نتیجے میں ایسی ادبی اور اصلاحی تحریکیں سامنے آئیں جو انگریزی ادب سے متاثر تھیں۔ سرسید کی تحریک اور انجمن پنجاب نے بھی انگریزی ادب سے متاثر ہونے کے بعد انگریزی اصناف کو اردو میں متعارف کرایا۔ طویل داستانوں، قصوں کہانیوں کو سننے کے لیے وقت کی کمی کے باعث افسانے جیسی صنف وجود میں آئی۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''یقیناً مہابھارت، جاتکا، پنچ تنتر، ہو پدیش اور کتھا سرت ساگر کی کہانیوں کو جنم دینے والا یہ دیس تخلیقی ادب کی اس صنف کا سب سے بڑا مرکز ہے۔''(۲)

افسانہ نگاری کے آغاز میں ہمیں افسانوں میں موضوعات اور تکنیک کا تنوع کم ہی ملتا ہے۔ افسانوں میں زیادہ تر داستانوں اور قصے کہانیوں کا عکس نظر آتا ہے۔ معاشرتی اور سماجی ارتقا نے بھی اصناف کے مختلف زاویوں میں وسعت پیدا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ساخت اور ہیئت میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ افسانے کی تکنیک اور ساختی تبدیلیوں کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''اردو افسانے کی ابتدا اور نشو و نما کی کہانی، بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ارتقا سے گہرا

ربط رکھتی ہے لیکن حقیقت یہ کہ بہت سارے عناصر کے اشتراک اور سطحی مماثلت کے باوجود اردو کا مختصر افسانہ عصری تقاضوں ہی کا نتیجہ ہے۔''(۳)

اکیسویں صدی کا جدید افسانہ اردو نثر میں سب سے زیادہ لکھی جانے والی صنفِ ادب ہے۔آج کا افسانہ بھی ماضی کی طرح اپنے اندر اختصار، وحدت، تاثیر، پلاٹ، تکنیک، موضوع، کردار نگاری، اسلوب، ایجاز و رمزیت، جزیات نگاری کے تمام خصائص رکھتا ہے۔افسانہ نگار اپنے ذہنی وفکری ادراک، تخیل اور مشاہدے کی مدد سے کسی ایک واقعہ میں حقیقت کا رنگ بھر دیتا ہے۔حقیقت کتنی ہی تلخ و شیریں کیوں نہ ہو کسی نہ کسی کہانی سے جڑی ہوتی ہے۔اس میں واقعات کی ترتیب اور اتار چڑھاؤ ایک کہانی کی طرح ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔مصنف کی فکری جدت اس میں مزید رنگ بھر دیتی ہے افسانے کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب ''اردو افسانہ، روایت اور مسائل'' میں لکھتے ہیں:

''افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے اور یہ کہانی ماحول اور اس کے کرداروں سے مرتب ہوتی ہے۔''(۴)

زندگی ہمیشہ سے حرکت پذیر ہے اور اس کے ارتقائی مراحل بھی ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہیں۔زندگی کے بارے میں یہ دعویٰ عبث ہے کہ یہ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گئی ہے افسانہ بھی اپنی ہیئت اور ساخت میں زندگی ہی کی حقیقتوں کا ترجمان ہے جس طرح اور جیسے جیسے زندگی مختلف مراحل سے گزرتی ہے اسی طرح افسانہ بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہتا ہے۔اور اس کو زندگی اور وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مختلف فکری وفنی تبدیلیوں کی ضرورت بھی ناگزیر ہے۔ہم کسی صورت میں بھی افسانے کی ساخت کا حتمی تعین نہیں کر سکتے بلکہ یہاں تک کہ کوئی جامع تعریف بھی اسے اپنے اندر مقید نہیں کر سکتی۔ہر مصنف نے اسے اپنی سوچ کے مطابق معانی پہنائے ہیں۔آل احمد سرور کہتے ہیں:

''ایسا فریب جو حقیقت کو کچھ اور روشن کر دے اور وہ جھوٹ جو بغیر سچ کی مدد کے خوبصورت ہی معلوم نہ ہو۔''(۵)

افسانے نے مغربی ادب کی صنف ہونے کے باوجود بہت جلد اردو ادب میں اپنی جڑیں مضبوط و مستحکم کیں دن بدن بدلتی ہوئی شکل وصورت کے باعث یہ نہ صرف معروف صنف بنی بلکہ موثر بھی ثابت ہوئی۔رومانوی تحریک کے آغاز میں ہی سجاد حیدر یلدرم نے مثالی ماحول اور زندگی کی مصوری کرتے ہوئے ''خیالستان'' کو تخلیق کیا۔جو جذبوں کی روانی اور تخلیق کی بلندیوں کو عروج پر لے گئی۔اسی دور میں ترقی پسند تحریک ادیبوں کے لیے کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کی زندگی سے جڑے ہوئے زندہ موضوعات لے کر آئی۔اسی تحریک کے زیر اثر پریم چند نے کامیاب افسانہ نگاری کی اور ان کا افسانہ ''کفن'' اردو ادب کا ایک لازوال اور شاہکار افسانہ ثابت ہوا۔افسانوں میں حقیقت نگاری کے اسلوب میں، منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، غلام عباس، انتظار حسین اور اشفاق احمد نے عمدہ نمونے پیش کیے۔ان افسانہ نگاروں نے زندگی کی حقیقتوں، علامت نگاری اور زندگی کی اونچ نیچ کو افسانوں کا موضوع بنایا۔اسی دور میں پہلے علامت نگاری اور پھر تجریدی افسانے کا دور آیا۔مغرب میں جیمز جوائیس اور دیگر کے ہاں تجریدیت کی عمدہ مثالیں سامنے آئیں لیکن مشرق میں ایسے ادب کو ادبی ناقدین کی اکثریت پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کہانی اور افسانے کا نہ صرف حسن مجروح ہوتا ہے بلکہ کہانی اور پلاٹ کی ہئیت اور ساخت بھی مجروح ہوتی ہے بعض افسانوں میں بہت مبہم اور گنجلک علامتیں حقیقی طور پر افسانے کے تاثر کو زائل کرنے کا

سب بنتی ہیں۔ کیوں کہ علامت نگاری کے زیر اثر افسانے میں کہانی پن ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ ناقدین اور محققین طویل بحث مباحثہ کے بعد بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افسانہ کہانی کے بغیر آگے نہیں بڑھتا بعض جدید افسانہ نگار کہانی کو افسانے کا ایک اہم جز وقرار دیتے ہیں۔ انور سجاد، کرشن چندر، غلام عباس، عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانوں میں ہمیں کہانی ملتی ہے۔ بیسویں صدی میں عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے دنیا کے نقشے پر حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ معاشی اور معاشرتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں نے داخلی اور خارجی فضا کو ہر سطح پر متاثر کیا نہ صرف مذہبی، سماجی بلکہ اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اس ساری صورت حال کا اثر ادبی سطح پر بھی ہوا۔ انیسویں صدی کی تبدیلیوں نے انگریزی تعلیم کے فروغ کا رجحان بھی متعارف کروایا جن کے ردعمل میں نذیر احمد کے ناولوں نے مستقبل کے ناول اور جدید افسانے کے لیے فضا ساز گار بنائی، نذیر احمد کے ناولوں کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''مولوی نذیر احمد کی تصانیف جن کو ناولیں کہا جاتا ہے ''مراۃ العروس''، ''بنعات النعش'' دراصل تمثیلی افسانے ہیں۔''(۶)

اردو ادب میں سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کو افسانہ نگاری کے حوالے سے اولیت حاصل ہے قراۃ العین حیدر یلدرم کی تصانیف کے زمانی حسن کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''بیسویں صدی کے اولین برسوں میں جیسے یہ ایک نئی صبح ہو رہی تھی جس کے اجالے میں نئی چیزیں منظر میں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ ملک میں ایک عہد نو شروع ہو چکا تھا اس سے ہمارے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو فن برائے زندگی کی ضرورت تھی۔ انہوں نے آئیڈیل کو اپنایا اس وقت یلدرم نے لکھنا شروع کیا۔''(۷)

رومانیت کی ابتدا کا سہرا سجاد حیدر یلدرم کے سر ہے۔ ان کے ہاں جدت کی فراوانی ہے یلدرم کے ہاں ترقی پسند ادب کے اثرات نمایاں ہیں۔ انہوں نے انسانی بنیادی ضرورتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ یلدرم نے ادب کو فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ وقار عظیم ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا محرک رومانیت کا تصور اور ایک متوازن قسم کا احساس فن ہے۔''(۸)

پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے کیا۔ اس زمانے میں وہ نواب رائے الہ آبادی کے نام سے لکھتے تھے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کے نام سے تھا جو ۱۹۵۱ء میں ''زمانہ'' کانپور سے شائع ہوا۔ پریم چند کا نام پہلی مرتبہ (۱۹۱۱ء) زمانہ میں شائع ہونے والے ان کے افسانے ''بڑے گھر کی بیٹی'' کے سبب منظرِ عام پہ آیا۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے انہوں نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۱ء میں کیا۔ ان کے زیادہ تر افسانے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھے گئے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے غدر کے افسانے۔ بیگمات کے آنسو، انگریزوں کی بپتا، جنگ بیتی کی کہانیاں ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر مسعود رضا خاں لکھتے ہیں:

> ''خواجہ حسن نظامی کا کمال یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعہ کا انتخاب کر کے اس کے گرد تخیل کے ذریعے ایک فضا اور ماحول قائم کر دیتے ہیں۔''(۹)

افسانہ نگاری کا پہلا دور انیسویں صدی کی ابتدا سے پہلی جنگ عظیم کی ابتدا تک ہے۔اس دور کے نمایاں نام راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند اور سلطان حیدر جوش ہیں۔اس دور کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت معاشرتی اصلاح، رنگیں اندازِ بیاں، نثر میں بھی شاعرانہ انداز کی جھلک ہیں۔ افسانوں کے دوسرے دور میں پہلی جنگ عظیم کے ابتدا سے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں اور اقتصادی لحاظ سے جنگ کے اثرات اردو افسانے پر بھی مرتب ہوئے۔راشد الخیری کے ہاں اصلاح نسواں اور یلدرم کے ہاں رومانیت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا بلکہ نیاز فتح پوری نے اس رومانیت کو اور زیادہ شدید اور والہانہ بنادیا۔ نیاز فتح پوری کی طرح مجنوں گورکھ پوری بھی یلدرم کی رومانیت سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ مجنوں گورکھ پوری نے رومانیت میں فلسفہ کی چاشنی بھی شامل کردی۔ان کے ساتھ ساتھ آل احمد سرور نے بھی افسانے کی اس روش کو اپنایا بلکہ رومان نگاری اس دور کی با قاعدہ ایک روایت بن گئی۔

پریم چند کے ہاں یہ افسانوں میں فنی پختگی کا دور ہے۔ان کے ہاں مغربی تقلید اور سادگی کا رنگ نظر آتا ہے ان کے افسانوں میں اس دور کی جدید تحریک اور عوامی ردِ عمل کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں مہاشے سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی بھی نمایاں طور نظر آتے ہیں۔مہاشے سدرشن کے ہاں پریم چند کا رنگ نظر آتا ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی زندگی اور متوسط طبقہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اعظم کریوی کے زیادہ تر افسانوں میں سیاسی رنگ اور سیاسی پس منظر نظر آتا ہے۔اس دور میں بہت سے ادیبوں نے افسانہ نگاری کی طرف توجہ دی۔جن میں امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع، عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، شیخ عبدالقادر، احمد حسین خاں، افضل علی، حامد علی خاں، عظیم بیگ، حامد اللہ افسر، حکیم یوسف حسن، مولانا ظفر علی خاں، عطا الرحمٰن، عاشق حسین وغیرہ ہیں۔اس دور کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اب سے پچاس سال پہلے میں جس دور سے گزر رہا تھا وہ دراصل افسانہ نویسی کا نہیں بلکہ افسانہ خیزی کا دور تھا۔''(۱۰)

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی معیشت اور معاشرت دونوں پر اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔شہروں میں صنعتی انقلاب کی بدولت ہمیں دیہاتوں کے لوگوں کا رخ شہر کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔اس صنعتی انقلاب کے باعث ہی سرمایہ دار اور مزدور کے ہاں کشمکش کا آغاز ہوا۔سیاست میں بھی ماحول کے اثرات کا ہر عمل دخل ہوا۔افسانہ اس ماحول سے پوری طرح متاثر ہوا۔

تیسرے دور میں راشد الخیری، پریم چند اور یلدرم کے افسانوں کے اثرات نمایاں رہے۔ پریم چند کے ہاں ہندوستانی رنگ ان کی خاص خصوصیت تھا اس لیے انہیں ہندی افسانے کا موجد بھی قرار دیا جاتا ہے۔مہاشے سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی نے اس دور میں شاہکار افسانے تصنیف کیے۔کچھ اور نئے لکھنے والوں میں اختر اور ینوی اور سہیل اعظم کے نام قابل ذکر ہیں۔

مہاشے سدرشن نے اپنے افسانوں میں پریم چند کی طرح ہندوؤں کی معاشرتی اقدار کو موضوع بنایا۔پریم چند کی تقلید کے ساتھ انہوں نے الگ پہچان بھی بنائی یعنی پریم کے برعکس سدرشن نے شہری زندگی اور تعلیم یافتہ طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے افسانوں کے مجموعے درج ذیل ہیں۔

سدا بہار پھل، بہارستان، چندن، قوسِ قزح، سوم سنگھار، چشم و چراغ، سدرشن کے افسانوں میں جذبات نگاری اور

انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ اصلاحی رنگ کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔علی عباس حسینی نے سب سے زیادہ پریم چند کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا۔ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور اندازِ بیان کی سادگی کا عکس ملتا ہے۔ان کے موضوعات میں زیادہ تر دیہات، زمینداروں کے معاشرے کے داخلی اور خارجی معاملات کے نقوش ملتے ہیں۔وہ نفسیاتی معاملہ کو بھی سمیٹ دیتے ہیں۔ان کے ہاں فنی وپختگی کا احساس ہوتا ہے۔سید وقار عظیم ان کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''علی عباس حسینی کے دردمند دل نے یہات کی زندگی میں درد وغم کے ان گنت موقعے تلاش کر لیے۔علی عباس حسینی کے افسانوں میں رفیقِ تنہائی، بھوکی بنسی، سکھی اور بوڑھا بالا، یہاں ایک طرف دیہات کی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مبصرانہ مرقعے ہیں وہاں دوسری طرف فن کے حسن و جمال اور سحر کاری کے بے حد دل نشیں نمونے بھی ہیں۔''(۱۱)

جس دور میں اردو افسانہ اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا مغربی دنیا ایک زبردست معاشی بحران سے گزر رہی تھی۔ جس نے اُن کے سماجی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔فسطائیت اور اشتراکیت میں کشمکش شروع ہو چکی تھی جس کا اثر امریکہ، انگلستان، فرانس اور چین تک جا پہنچا تھا۔ادب میں بھی اس کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔ادب ہمیشہ سے اپنے زمانی رجحانات اور رویوں کا ترجمان رہا ہے سیاسی، سماجی اور معاشی بحران کے اس زمانے میں ادیبوں نے ایک سمت کی تلاش شروع کر دی۔اس تلاش کے نتیجے میں ۱۹۳۵ء میں مختلف خطوں میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔اس تحریک کے زیرِ اثر جو ادب تخلیق ہوا اس میں سامراجیت اور فسطائیت کے خلاف انتقامی جذبات کارفرما تھے۔اس چیز کو رویوں کی شدت میں بھی محسوس کیا جا رہا تھا۔ترقی پسند تحریک کے ساتھ ایک اور رجحان پیدا ہوا کہ ایک ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو تصورات کی بجائے حقیقت پر مبنی ہو اور حقیقت کو قبول کیا جائے اور ادب کا حصہ بنایا جائے۔اس طرح ادب میں ایسے کئی گوشے بے نقاب ہوئے جن کو پہلے ادب کے لیے ممنوع سمجھا جاتا تھا اور ایمانیت اور رمزیت کے پردوں میں لپیٹ کر ادب میں جگہ دی جاتی تھی۔ان موضوعات کو کھلم کھلا بیان کیا جانے لگا۔ حقائق کی یہ عریانیت بہت جلد ادب کا حصہ بن کر اطرافِ دنیا میں پھیل گئی۔ایسے اذہان جنہیں مغرب میں رہ کر مغربی ادب سے براہ راست اکتساب کا موقع ملا تھا۔جب برصغیر میں آنے کا موقع ملا تو یہ نظریات مشرقی ادب کا بھی حصہ بن گئے اور طے پایا کہ ہندوستانی ادیب بھی ہندوستانی زندگی اور معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں بھی سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیں اور رجعت پسندی اور ماضی پرستی کی روایات اور رجحانات پر بند باندھیں اور ادب کو عوامیت کا حصہ بنائیں جو مستقبل کی تعمیر میں زندگی کا عکاس ہو جس میں بھوک، پیاس، افلاس، غلامی، محکومی اور سماجی پستی کو بے نقاب کیا جائے۔پریم چند، جوش ملیح آبادی، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، مجنوں، علی عباس حسینی، ساغر نظامی اور نئے لکھنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر تاثیر، احمد علی، اختر انصاری جیسے لوگوں نے ان نظریات کا خیر مقدم کیا۔اس دور میں پریم چند نے کفن جیسا شاہکار افسانہ تخلیق کیا جسے اردو افسانے کا اہم سنگ میل قرار دیا گیا اسی دور میں اردو ادب میں چند اور افسانے بھی سامنے آئے جو انگارے کے نام سے شائع ہوئے۔انگارے کے بارے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''دسمبر ۱۹۳۲ء میں نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو سے ایک ہزار کی تعداد میں نو افسانوں اور ایک ڈرامے کا مجموعہ ''انگارے'' ۱۳۴ صفحات پر مشتمل چار افراد (سجاد ظہیر، احمد علی، رشید

جہاں اور منصور ظفر کی مشترکہ تخلیقی کاوش کے طور پر سامنے آیا۔''(۱۲)

اس دور میں افسانوں میں ہندوستانی سیاست، معاشرت اور مذہب پر کھلم کھلا تمسخر، طنز کی روش متعارف ہوئی۔اس باغیانہ روش نے آہستہ آہستہ ابتذال کی صورت اختیار کر لی۔اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ افسانہ نگاروں نے مغربی افسانہ نگاروں کا ازخود بڑے قریب سے مطالعہ کیا۔اس دور کی افسانہ نگاری میں جنگ عظیم کے اثرات کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔اس رجحان کے حامیوں میں احمد ندیم قاسمی، منٹو،عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، دیوندر ستیار تھی شامل ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے کرداروں کے نفسیاتی مطالعے کو اہمیت دیتے ہوئے لاشعور میں چھپی ہوئی ناآسودہ خواہشات کو بے نقاب کرنے کے لیے عریاں نگاری سے بھی اجتناب نہ کیا۔پھر یہی رجحان ہمیں ممتاز مفتی اور آغا بابر کے ہاں بھی نظر آنے لگا۔انفرادی پہلو کی اس روش میں شفیق الرحمٰن کا نام بھی قابل ذکر ہے۔جس نے اپنے افسانوں میں تفریحی ظرافت اور رمزیت نگاری کو اپنایا،شوکت تھانوی اگرچہ پہلے ہی طنزیہ ظرافت کو اپنا چکے تھے۔اس دور میں بھی ان کا یہی رجحان برقرار رہا۔نئے لکھنے والوں میں بلونت سنگھ، غلام عباس اور قرۃ العین کے نام قابل ذکر ہیں۔جنھوں نے افسانہ نگاری میں ایک نئے رجحان کی آبیاری کی۔

افسانہ نگاری کے اگلے دور میں ۱۹۴۷ء کے واقعات، فسادات، قتل و غارت، اغواء، آبروریزی اور ہجرت کے سانحہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔کرشن چندر بیدی،عصمت، منٹو نے فسادات کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے برعکس اختر انصاری، احمد علی، حسن عسکری، نیاز فتح پوری وغیرہ اپنا گزشتہ افسانوی معیار برقرار نہ رکھ سکے۔مہاشے سدرشن تقسیم سے پہلے ہی فلمی دنیا میں چلے گئے جبکہ علی عباس حسینی اور مجنوں گورکھپوری لکھتے رہے:

> ''کرشن چندر نے ماحول کا جائزہ لینے کے لیے تجزیہ اور تخیل کا طریق اختیار نہیں کیا بلکہ ایک بلندی پر سے زمین پر نظر ڈالی ہے اور زندگی کی تصویر کو کاغذ پر اتار لیا ہے اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ کرشن چندر کے ہاں ماحول اور فضا کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔''(۱۳)

آل احمد سرور کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کے افسانوں میں ترشے ہوئے ہیروں کی چمک نہ ہونے کے باوجود زندگی کی رنگینی اور اس کی امیدیں اور مایوسیاں، اس کا فن اور بدصورتی ملتی ہے کرشن چندر ایک شاعر کا دل اور ایک مصور کا قلم رکھتا ہے۔''(۱۴)

ان کے ہاں فن کا اعلیٰ تخلیقی احساس اور اسلوب میں شاعرانہ امتزاج ملتا ہے۔احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی تہذیبی، سماجی، دینی زندگی اور اس کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔وہ پریم چند سے متاثر ہونے کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''میرے پچھتر فیصد افسانے ایسے ہیں جو میں نے اختر شیرانی یا جوش ملیح آبادی کے اشعار سے متاثر ہو کر لکھے۔''(۱۵)

قاسمی کے بعد عصمت کی افسانہ نگاری میں ہمیں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے، گھریلو ماحول اور نوجوانوں کے مسائل کی بڑی کامیاب تصویر کشی نظر آتی ہے۔عصمت کے جوشیلے اور تیکھے پن کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے

ہیں:

''حق کے اظہار کے لیے انہوں نے بہت سے لطیف اور شدید حربوں سے کام لیا ہے تیکھے طنز، چست فقرے، شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی باتیں، ہنسی مذاق میں، ہجو، ملیح پھبتیاں، باتوں کی چٹکیاں، ہنس ہنس کر سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ یہ سب سیدھی سادی روزمرہ کی باتیں ان کے فن کے تھوڑے سے حربے ہیں۔''(۱۶)

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں موضوعات کی وسعت، تخیل کی رنگینی، فکر کی بلندی اور بھرپور مشاہدے کی گہرائی ملتی ہے۔ سعادت حسن منٹو نے مغربی افسانہ نگاروں کے مطالعہ سے اکتسابِ فن کیا۔ منٹو کے ہاں حقیقت نگاری کا ایک بھرپور عکس ہے۔ قلم کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا۔ ان کے افسانوں میں سیاست، معاشرت، زندگی کی انفرادی، اجتماعی اور تلخ حقیقتوں کو بڑی بے باکی سے بیان کیا گیا ہے جنسی رمزیت کی ترجمانی منٹو کا ایک خاص موضوع ہے۔ ان کے افسانے فنی پختگی اور اسلوبیاتی نقطہ نظر سے ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ وزیر آغا ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منٹو نے نہ صرف ایک محدود سے میدان کو اپنے لیے منتخب کیا تھا بلکہ زندگی کو بھی محض غسل خانے کے روزن سے دیکھا تھا چنانچہ اسے زندگی کا ایک خاص پہلو ہی نظر آیا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس خاص پہلو کی عکاسی میں منٹو نے ذہانت، خلوص اور گہری نظر کا ثبوت دیا۔''(۱۷)

ممتاز مفتی نفسیاتی رجحان کے علمبردار کے طور پر سامنے آتے ہیں وہ افسانوں میں کرداروں کے منفی پہلوؤں کو بڑی مہارت سے بے نقاب کرتے ہیں۔ فرمان فتح پوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نفسیاتی مسائل خصوصاً لاشعور اور تحت الشعور کی کیفیات کو اوّل اوّل ممتاز مفتی نے برتا ہے۔ فرائیڈ کے نظریہ نفس، لاشعور اور تحلیلِ نفسی کو جس طرح انہوں نے افسانے میں برت کر دکھایا ہے۔ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے ان کے بیش تر افسانے ایک لحاظ سے علامتی افسانے بھی کہے جا سکتے ہیں کہ ان کی ظاہری سطح بالکل مختلف ہے۔''(۱۸)

حسن عسکری نے اپنے افسانوں میں تکنیک کے نئے نئے تجربات کیے ان کے ہاں ادبی چھاپ دکھائی دیتی ہے اور کردار نفسیاتی الجھاؤ کا شکار نظر آتے ہیں۔ معاشرتی مسائل کا عکس ان کے افسانوں میں بھرپور ملتا ہے۔ عزیز احمد کے ہاں مغربی اثرات نمایاں ہیں انہوں نے تاریخ تحقیق اور سیاست کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ ان کے وسیع مطالعے اور مشاہدے نے مغربی ادب سے بہت استفادہ کیا۔ مغربی اور مشرقی دونوں تہذیبوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے یہی اثرات ان کے افسانوں میں بھی ملتے ہیں۔ آغا بابر نے نفسیاتی موضوعات میں معمر لوگوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل پہ کھل کر لکھا اور حقیقت نگاری کے اعلیٰ مرقعے پیش کیے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''جنس کو مرد کے زاویے سے دیکھنے کا منفرد انداز آغا بابر نے پیدا کیا آغا بابر ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو افسانے کے تارو پود کو بڑی چابکدستی سے بنتے ہیں اور اختتام پر قاری کے حواس پر چھا جاتے ہیں۔''(۱۹)

شوکت تھانوی اور شفیق الرحمٰن نے مزاح نگاری میں اپنا ایک الگ انداز متعارف کروایا۔ان کے افسانوں میں رومان اور مزاح یک جان ملتے ہیں۔وہ تشبیہات استعاروں سے افسانوں میں مزاح کی چاشنی پیدا کرتے ہیں۔

غلام عباس کا شمار بہت اہم اور چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ان کا افسانہ آنندی اسلوب اور کردار نگاری کے حساب سے بے مثال افسانہ ہے متوسط طبقے کی شہری اور دیہاتی زندگی کے بنیادی موضوع میں وہ انسانی رویوں کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔ان کا انداز اُن کے ہم عصروں سے مختلف ہے۔قدرت اللہ شہاب اردو افسانے کے چوتھے دور کے افسانہ نگار ہیں انہوں نے جرات،ادب اور بے باکی سے افسانے لکھے۔اور معاشرتی حقیقتوں کو افسانوں کا موضوع بنایا ان کے بہترین افسانوں میں افسانے ،نفسانے اور ماں جی کی شہکار مثالیں ملتی ہیں۔

مرزا ادیب نے اردو افسانہ میں رومانیت کا عکس پیش کیا آزادی کے پہلے کے افسانوں میں جذبہ حریت نمایاں ہے۔جو علمی جدوجہد کا درس بھی دیتے ہیں ان کے افسانوں میں ان کا جذباتی لہجہ نظر آتا ہے۔

قراۃ العین نے بورژوا طبقے کی نمائندگی کی اور ایک منفرد اندازِ تحریر اپنایا اگرچہ ان کے افسانوں کی تعداد کم ہے مگر فن کی اعلیٰ مثالیں ہیں ان کے افسانوں میں مغربی تہذیب اور مغربی تمدن دونوں کی چاشنی ہے،ستاروں سے آگے،شیشے کے گھر،فصلِ گل آئی یا اجل آئی،پت جھڑ کی آواز اور ہاڑ کی ایک دھند عمدہ افسانے ہیں۔حاجرہ مسرور نے کم عمری میں افسانہ لکھنا شروع کیا اور اپنے تخلیقی اسلوب کی بنا پر شہرت پائی ان کی ہلکی پھلکی کہانیوں میں معاشرے کے ہر پہلو کا عکس ملتا ہے۔

خدیجہ مستور کے ہاں حقائق کے ساتھ ساتھ رومانیت کا بیان بھی ملتا ہے اور ساتھ ساتھ جدیدیت سے عملی وابستگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ان کے ہاں محنت کش طبقے کی ناگفتہ بہ حالت اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں،جنگ کے اثرات اور فسادات کے موضوع پر افسانے ملتے ہیں۔خدیجہ نے عورتوں کے مسائل پہ بھی کثرت سے لکھا ہے ان کا خاص موضوع عورت کا استحصال ہے۔جیلانی بانو نے حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ افسانوں کی اعلیٰ تکنیک کو برتا اور اعلیٰ معیار کے افسانے لکھے۔ممتاز شیریں نے مغربی ادب خاص طور پر فرانسیسی ادب کو متعارف کروایا۔

جدید دور میں تجریدی اور علامتی افسانے کا رجحان پروان چڑھا۔رشید امجد علامتی اور تجریدی افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔وہ سماجی برائیوں کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔داخلی اور خارجی مفاد اور اجتماعی انسانی المیے کے خاص موضوعات ان کے ہاں ہمیں روایتی تکنیک نظر نہیں آتی۔انہوں نے مختصر افسانے کو نئی جہت بخشی۔آزادی کے بعد اردو افسانے کی ایک نئی شکل سامنے آئی۔افسانوں میں طوالت کی بجائے ایجاز واختصار سے کام لیا جانے لگا۔اشاریت اور ایمائیت کا ایک نیا رجحان سامنے آیا ان لکھنے والوں میں ابراہیم جلیس کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے ان کے افسانوں میں بھی ترقی پسندیت اور جدید رجحان نمایاں ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں محبت کے موضوع کو استعمال کیا اس میں گھریلو،خاندانی اور بچوں کی محبت ونفسیات کو انہوں نے انتہائی مہارت سے پیش کیا ان کی تحریروں میں شاعرانہ وصف نمایاں ہے ان کا مشہور افسانہ ''ایک محبت سو افسانے'' ہیں۔ان کے افسانوں میں شعور کی بلوغت کے ساتھ ساتھ فن کی پختگی نظر آتی ہے۔رومانیت اور فطرت سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔وہ فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مسائل وآلام کی بھی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں۔ان کے معروف افسانوں میں برف باری کی رات اور مٹی کی مونالیزا جیسے افسانے ہیں۔

شوکت صدیقی کے افسانوں میں ہمیں معاشرتی پہلوؤں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تہذیبی وثقافتی مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ وہ انسانی مسائل کی کشمکش کو اجاگر کرتے ہیں۔ ایجاز و اختصار ان کے افسانوں کی خاص خوبی ہے انسانی فطرت ظالم اور مظلوم دونوں کا بیانیہ ان کے ہاں ملتا ہے ان کے کرداروں میں انسانی فطرت کی عکاسی اور ذہنی کیفیات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ ''ڈھل گئی رات'' اور ''یہ بیمار'' جیسے افسانوں میں انہوں نے واقعات کی کردار نگاری کے زیادہ جوہر دکھائے ہیں۔

۱۹۵۸ء کے بعد ہمیں اردو افسانے میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایوب خان مارشل لا اور ستمبر کی پاک بھارت جنگ کے واقعات کا اثر اردو ادب پر بھی ہوا یہ عکس ہمیں انتظار حسین کے ہاں زیادہ نظر آتا ہے۔ انسانی گھٹن اضطراب اور کرب کو انہوں نے نمایاں طور پر پیش کیا۔ اس دور کے علامتی افسانہ لکھنے والوں میں انتظار حسین، خالدہ حسین، انور سجاد، مسعود اشعر اور رشید امجد شامل ہیں۔ ان میں نمایاں علامتی رجحان انتظار حسین کے ہاں زیادہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے متروک اسالیب کو بھی نئی صورت سے مربوط کر کے پیش کیا۔ انہوں نے تلازمۂ خیال کی تکنیک کو استعمال کیا اور قدیم وراثتی علامتوں کو استعمال کیا ان کے استعارے اور علامتیں قدیم داستانوں اور ہماری تہذیبی وثقافتی روایات کا حصہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں معنی کی کئی بے شمار تہیں پائی جاتی ہیں۔ انتظار حسین نے آخری آدمی، زرد کتا، ٹانگیں جیسے افسانوں میں علامتی اسلوب کے ذریعے انسانی فطرت اور معاشرتی قدروں کو بیان کیا ہے۔ وہ ہجرت اور سفر کے تجربے کو بڑی کامیابی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے اس پہلو کے بارے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین کا یہ باطنی تمثیلی شعر جو آخری آدمی کے افسانوں میں اپنے عروج پر ملتا ہے۔''(۲۰)

علامتی افسانے میں دوسرا بڑا نام انور سجاد کا ملتا ہے۔ انہوں نے مغربی اور مشرقی داستانوں کے کرداروں کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا۔ ان کے ہاں یونانی دیو مالا کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ ''پرومیتھس'' بہت اہم ہے۔ مسعود اشعر اور رشید جہاں کے ہاں فرد کی شکست وریخت اور فرد کی باطنی کشمکش کا اظہار ملتا ہے۔ مسعود مفتی، خدیجہ مستور اور فرخندہ لودھی کے ہاں بھی یہی رجحان ملتا ہے۔ انہوں نے بھی جنگ کے مسائل اور واقعات کو اپنے موضوعات میں استعمال کیا۔ فرخندہ لودھی نے اپنے افسانوں میں دیگر معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ نسوانی مسائل، عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور استحصال کو موضوع بنایا۔ ان کے ہاں ثقافتی، تہذیبی اور سماجی حقیقت پر بہت لکھا گیا۔ تقسیم ہند، فسادات اور دیہی زندگی ان کے بنیادی موضوعات میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو افسانے کے آغاز سے عہد حاضر تک بہت سے افسانہ نگاروں نے ہماری تہذیبی اور ثقافتی روایت میں حصہ ڈالا۔ اردو افسانہ نگاری کا ارتقا جاری ہے اور جاری رہے گا۔

اکیسویں صدی میں افسانوی تکنیک کا بدلنا ایک فطری امر ہے، اس بدلاؤ کے اثرات ہمیں آج کے تمام افسانہ نگاروں کے ہاں ملتے ہیں۔ آج کی فکری تبدیلی میں دہشت پسندی اور شدت پسندی زور پکڑتی اور روشن خیالی ماند پڑتی جا رہی ہے۔ مذہبی رجحانات اور اعتقادات کا رنگ بھی گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مابعد جدیدیت کا تصور افسانوں پر بھی غالب نظر آتا ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانوی رویوں کے بارے میں پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

> ''افسانے میں ہیئتی تبدیلی کو دیکھیں تو آج نہ ہی وحدت تاثر کی وہ اہمیت ہے اور نہ ہی کسی کمنٹ منٹ سے وابستگی، البتہ زبان کی سطح پر تجربوں کا ایک طوفان سا ہے۔ لسانی تجربات

،فنی تجربات، ہئیتی تجربات۔''(۲۱)

اکیسویں صدی کا افسانوی ادب نئی تکنیک، نئے اسالیب اور نئے بیانیے کے ساتھ ان تمام موضوعات کا احاطہ کر رہا ہے جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان، معاشرہ اور زندگی سے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انسائیکلو پیڈیا، امریکانا، ص:۷۵۲
۲۔ احتشام حسین، ڈاکٹر، بحوالہ ڈاکٹر احمد احسن، کرشن چندر کی افسانہ نگاری، لاہور: فکشن ہاؤس،۱۹۹۲ء، ص:۱۵
۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۲ء، ص:۱۸
۴۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو افسانہ روایت اور مسائل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۶ء، ص:۴۷
۵۔ سرور، آل احمد، تنقیدی اشارے، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۳ء، ص:۷۷
۶۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص:۲۵
۷۔ قرۃ العین حیدر، مضمون: سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری، ص:۶۲
۸۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، دہلی: جمال پریس پرنٹنگ،۱۹۷۲ء، ص:۲۰۷
۹۔ مسعود رضا خان، ڈاکٹر، اردو افسانے کا ارتقا، ص:۵۶
۱۰۔ نیاز فتح پوری، مضمون: اردو افسانہ اور افسانہ نگاری، مشمولہ: ادبی دنیا، ص:۴۳
۱۱۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، ص:۲۱۰
۱۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، ص:۱۳۲
۱۳۔ وزیر آغا، رسالہ ادبی دنیا، شمارہ اول، ص:۸۶۔۱۸۶
۱۴۔ سرور، آل احمد، مضمون: اردو افسانہ نگاری، اردو افسانہ روایت اور مسائل، ص:۹۸
۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ: چوپال، ص:۱۳
۱۶۔ وقار عظیم، نیا افسانہ، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، طبع دوم،۱۹۵۸ء، ص:۲۵۔۱۲۴
۱۷۔ وزیر آغا، رسالہ ادبی دنیا، شمارہ اول، ص:۳۴
۱۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگاری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء، ص:۹۱
۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد، ص:۴۳
۲۰۔ نارنگ، گوپی چند، مضمون: انتظار حسین کا فن، مشمولہ: اردو افسانہ متحرک ذہن کل سفر، ص:۵۴۵
۲۱۔ صفیر افراہیم، پروفیسر، مضمون: اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اردو افسانہ،۲۰۱۱ء

☆......☆......☆